ریت پر پڑتا ہے کہیں بھی نہ دیکھا۔ اس لئے اندازہ لگایا کہ اونٹ کی دم کٹی ہوئی تھی ۔ ۔ ۔ سوداگر یہ سن کر اونٹ کی تلاش میں سرگرداں ہوا۔ اور قاضی شہر ان ذی فہموں کو لے کر گھر چلا کہ جانتا تھا ایسے ذکی لوگ عام انسان نہیں بڑے ظرف کے قیافے تمام درست تھے اور پھر بھی وہ سمجھ نہ سکتا تھا کہ اونٹ مع مال و اسباب قیمتی کہاں گیا؟ ۔ ۔ ۔ اسی فکر میں غلطاں وہ صبح تک بیٹھا رہا۔ اردگرد سگریٹوں کے جلے، ادھ جلے اور بے دردی سے بجھائے گئے سگریٹ پڑے تھے ۔ ۔ ۔ بہت سالوں کے بعد اس نے پہلی بار صبح کاذب کو دیکھا۔ پہلے شہر کا آسمان کاسنی ہوا، پھر خاکستری اور بعد میں انڈے کی سفیدی کی مانند دودھیا سفید ہو گیا۔ اس کے منہ کا مزہ اس طرح تھا جیسے روزوں میں سحری کھا کر بہت دیر سونے کے بعد جاگا ہو۔ ۔ شہر خاموش تھا اور مؤذن کی آواز اندھیرے اجالے کو چیرتی آ رہی تھی۔ اس نے ٹھنڈی سل پر سر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا ۔ ۔ ۔

"اے رب العالمین! یہ تیری نگری میں کیا دستور ہے کہ قیافے غلط نکلتے ہیں ۔ ۔ ۔ ایسا کیوں نہیں کہ تو ہی انصاف کر دیا کرے؟ تو راہ کیوں نہیں سجھا دیتا؟ تو آزمائشوں میں کیوں ڈالتا ہے؟ تو سیدھی راہ کیوں نہیں دکھا دیتا؟ تیری اس نگری میں انصاف کیوں نہیں ہے؟ ۔ ۔ ۔"

یکدم وہ سارے آنسو جو رات بھر اس کے لاشعور میں اکٹھے ہو رہے تھے سل کی ٹھنڈی لاش پر پڑنے لگے ۔ ۔ ۔ آہستہ آہستہ تواتر کے ساتھ پہلے وہ

اتنی سی بات پر رشّو یوں بلبلا کر روئی کہ ملک صاحب پریشان ہو گئے۔ لیکن جب انہوں نے رشّو کو چپ کرانا چاہا تو وہ بپھر کر بولی۔

"مجھے ہاتھ نہ لگایئے خدا کے لئے ۔۔۔ آپ کے ہاتھ تو کسی ہوس کے ہاتھ ہیں ۔۔۔ پرے رکھیئے انہیں ۔۔۔ کسی کا خیال نہیں، کسی پر ترس نہیں ۔۔۔ بس ۔۔۔ اپنا ہی خیال ہے۔"

ملک صاحب کا دل کٹ گیا۔ لیکن وہ زندگی میں اتنا کچھ برداشت کر چکے تھے کہ خاموشی سے پلنگ پر لیٹ گئے۔ رشّو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر روتی رہی۔ دو چار بار وہ کھانسے۔ ایک آدھ بار انہوں نے پلٹ کر بھی دیکھا لیکن پھر چار وٹامن کی گولیاں اور دو سلیپنگ پلز کھا کر وہ خاموشی سے سو رہے۔

پہلے کچھ دیر تو رشّو بڑے جوش سے روتی رہی۔ پھر پلنگ کے پاس آ کر ملک صاحب کو دیکھنے لگی ۔۔۔ ان کی خراب آور گولیوں کی بوجھل نیند سے رشّو کو اللہ واسطے کا بیر ہو گیا۔

پہلے قدر جو قائداعظم کی طرح مضبوط اور پر اعتماد تھا اب رنجیت سنگھ والی پنجاب کی طرح اندر سے کانا نکل آیا تھا۔

پہلے ملک صاحب چپ کرانے پر آمادہ تھے تو رشّو نے ان کی ہمدردی کو ٹھکرا دیا اب وہ سو گئے تھے تو انہیں پتھر دل سمجھ کر وہ اور زور سے رونے لگی ۔۔۔

پچھتاوے کی آگ سے بالآخر امید کا سمندر پیدا ہوا۔

یہ سمندر آگ چاٹتا تھا۔ آگ کھاتا تھا۔ آگ کی جھلسی ہوئی ہوا میں سانس لیتا تھا۔ وہ لمبے دیوان پر شنیل کا تکیہ ڈالے اوندھی لیٹی تھی۔ ہولے ہولے ماضی لوٹ رہا تھا۔ دبے پاؤں سات سمندر پار سے آنے والا دولہا دروازے پر اتنی مدھم دستک دے رہا تھا جیسے پتنگا کمرے میں آنے کے لئے پر پھڑپھڑا رہا ہو...

ظفر کتنا خوبصورت تھا!

اس کے خطوں میں کیسی حیا تھی کیسی سادگی تھی!

ظفر اسے کلاس میں کیسے دیکھتا تھا!

ظفر نے اس کی تصویریں کھینچی تھیں شالامار میں!

یکدم اس کا دل چاہا کہ وہ واپس کالج جائے اور ایک نظر ظفر کو دیکھے۔

دبے پاؤں اس نے ڈریسنگ ٹیبل میں سے اپنا پرانا ٹرنک نکالا۔ اور اپنی کاپیاں کتابیں اکٹھی کرنے لگی... ہولے ہولے اس کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے .... ایسے آنسو جو آج تک اس کی آنکھوں میں نہ آئے تھے.... ایسے آنسو جو موت سے ہم کنار اور محبت سے بھیگے ہوئے تھے۔

میں سوتی ہوں پر میرا دل جاگتا ہے۔

یہ میرے محبوب کی آواز ہے جو کھٹکھٹاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔

میرے لئے دروازہ کھول! میری محبوبہ! میری پیاری!

میری کبوتری! میری پاکیزہ!

کیونکہ میرا سر شبنم سے تر ہے۔

اور میری زلفیں رات کی بوندوں سے بھری ہیں۔

میں تو کپڑے اتار چکی ہوں اب پھر کیسے پہنوں؟

میں تو اپنے پاؤں دھو چکی اب ان کو میلا کیوں کروں؟

میرے محبوب نے اپنا ہاتھ سوراخ سے اندر کیا

اور میرے دل و جگر میں اس کے لئے جنبش ہوئی۔

میں اپنے محبوب کے لئے دروازہ کھولنے کو اٹھی

اور میرے ہاتھوں سے مُر ٹپکا

اور میری انگلیوں سے رقیق مُر ٹپکا۔

اور قفل کے دستوں پر پڑا۔

میں نے اپنے محبوب کے لئے دروازہ کھول دیا۔

لیکن میرا محبوب مڑ کر چلا گیا تھا۔

جب وہ بولا تو میں بے حواس ہو گئی۔

میں نے اسے ڈھونڈا پر نہ پایا۔

میں نے اسے پکارا پر اس نے مجھے کچھ جواب نہ دیا۔

پہرے والے جو شہر میں پھرتے ہیں مجھے ملے۔

انہوں نے مجھے مارا اور گھائل کیا۔

شہر پناہ کے محافظوں نے میری چادر مجھ سے چھین لی۔

اے یروشلم کی بیٹیو!

میں تم کو قسم دیتی ہوں کہ میرا محبوب اگر تمہیں

مل جائے تو اس سے کہہ دینا

کہ میں عشق کی بیمار ہوں۔

سطوت شہر میں ظفر خارش زدہ کتے کی طرح گھوم پھر رہا تھا۔ کبھی غازی کے پاس چلا جاتا کبھی تیسری منزل کی تیسری کھڑکی کے سامنے جا کر جہانگیر کے مقبرے کے دھندلے مینار دیکھنے لگتا۔ وہ کتنی بار اپنے باپ کے کمرے میں گیا۔ اور لوٹ آیا کیونکہ وہاں اس کے باپ کی خوشبو تھی۔ اس کے باپ کی کتابیں تو تھیں لیکن اس کے باپ کا وجود نہیں تھا۔

فرید ہاری ہوئی فوج کے علم کی طرح روندا جا چکا تھا۔ جوں جوں وہ محسوس کرتا کہ رشو اس کی نہیں ہے۔ جوں جوں اس پر یہ حقیقت کھلتی کہ رشو اس وقت اس کے باپ کے ساتھ کراچی کے کسی بڑے ہوٹل میں مقیم ہو گی تو اس کا عشق منہ زور گھوڑے کی طرح بے قابو ہو جاتا۔ پہلے کچھ دن تو اس نے جیسے کا[illegible] وہ کے اثر تلے گزارے ہو رفتہ رفتہ جب اس کے ذہن نے یہ بات

قبول کر لی کہ رشیدہ میر اب رشیدہ ملک ہو چکی ہے تو زلزلے سے گرنے والی عمارت کے ملبے سے اس کا عشق متعفن لاش کی طرح نکلا . . . . مسخ شدہ متعفن اور مکروہ صورت! پہلے تو اس نے اس عشق کو دبانے اسے بھسم کرنے کی ترکیبیں سوچیں پھر اپنی زندگی ختم کرنے کے پلان بناتے . لیکن یہ عشق تو پرانی بنیادیں رکھتا تھا اتنی جلدی کیسے ختم ہو جاتا .

وہ کئی راتیں جناح باغ کی روشوں پر ٹہلتا رہا . بہار کے دن تھے . فضا میں کھلے ہوئے پھولوں کی مہک تھی . تمباکو کے کیاروں کی خوشبو تھی . روشوں پر اس کے پھول کھلے تھے . قطعہ در قطعہ گلاب اور تختہ در تختہ ان شعلہ رو پھولوں کی بہار تھی جو خوش رنگ بھی تھے اور معطر بھی . . . . اس باغ نے اس کے عشق کو تھپتھپانے کی بجائے ان پھولوں کی طرح دہکا دیا جو سوکھے درختوں پر چاپانی مشعل کی طرح چمکا کرتے ہیں . اور جنہیں مالی لوگ "جنگل کی آگ" کہتے ہیں .

باغ جناح نے اس کے دل کو برف میں لگانے کے بجائے اس میں جنگل کی آگ دہکا دی تھی . اور اب صدیوں پرانے چیڑھ کے درخت دیودار کے درخت قرصوں سے لدے ہوئے گوند سے بھرے ہوئے تنے تیورا کر گر رہے تھے . . . . شعلہ ساں جل رہے تھے . جتنی دیر وہ دھوپ گھڑی کے پاس بیٹھا رہتا مرائی بر آمدوں والے ہوٹل سے گانوں کی آواز آتی رہتی . . . . لتا آہیں بھرتی . اس سے وہ وعدے کرتی جو ایفا کا نقاب الٹ کر جفا میں بدل چکے تھے . . . . اسے

اس دھوپ گھڑی سے بڑا گہرا لگاؤ ہو چکا تھا۔ وہ پہروں اسے دیکھتا۔ سامنے فٹ پاتھ پر ٹہلتی عورتیں ۔ ان کے تعاقب میں بھاگتے بچے ۔۔۔۔۔ ان کے گرد منڈلاتے مرد بیمار سے نظر آتے تھے۔ وہ گھڑی کے لمحوں کو ان زندگیوں کی کڑی بنا لیتا۔ اور سوچتا رہتا بے ربط باتیں ۔۔۔۔ دکھ بھری باتیں ۔۔۔ بدھ کی طرح زندگی چھوڑنے کی باتیں ۔۔۔ سپوڑینی کی زندگی سے مستعار لی ہوئی باتیں ۔۔۔

ایسے ہی ایک دن جب وہ گھڑی کے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا تو کسی نے اسے آواز دی۔

"ظفر صاحب !"

مڑ کر دیکھا تو ڈمپل مسٹر اور مسز سعید کے درمیان کھڑی تھی۔

چھوٹے ہوئی پینٹ ، بڑھی ہوئی داڑھی میں وہ مارٹن لوتھر کا پادری دکھائی دیتا تھا۔

"ہائے میں نے تو آپ کو پہچانا ہی نہیں مسٹر ظفر !"

"سلام علیکم"

"آپ کالج نہیں آ رہے۔ پروفیسر اعجاز حسین روز پوچھتے ہیں آپ کا اور رشّو کا۔"

رشّو کا نام سنتے ہی ظفر کے کانوں کی لویں جلنے لگیں۔

گو ڈمپل اچھی طرح جانتی تھی کہ ابھی شہر میں رشّو کی شادی کی خبر نہیں پھیلی لیکن ملک صاحب اسے بتا چکے تھے کہ انہوں نے کم از کم ظفر کو ضرور بتا دیا تھا۔

"بس جی ایسے ہی۔"

"یہ مسٹر اور مسز سید ہیں۔"

دونوں طرف سے تکلف بھرے سلام ہونے لگے۔

ہلکا سا تعارف ہو چکنے کے بعد چند رسمی جملے اور کہے گئے اور پھر ڈمپل اور مسٹر اور مسز سید سڑک کی طرف جانے لگے۔ تھوڑی دیر ظفر ڈمپل کو دیکھتا رہا۔ پھر یک دم پیچھے بھاگا۔ ڈمپل آخری سیڑھی پر مسٹر سید کے ساتھ تھی اور مسز سید پہلی سیڑھی چڑھ رہی تھیں جب ظفر نے انہیں جا لیا۔

"مس شکیلہ ... پلیز!"

ڈمپل نے مڑ کر ظفر کی طرف دیکھا اور پھر مسٹر سید سے معذرت مانگتی نیچے اتر آئی ....

"مس شکیلہ!"

"کہیئے؟"

ظفر کے اندر الفاظ مجتمع ہو کر جملہ نہیں بن رہے تھے۔ سب کچھ گڈمڈ تھا۔ تمام سوال سارے جواب ...

"فرمایئے ..."

ظفر نے ایک نظر ڈمپل پر ڈالی اور پھر لب پر زبان پھیرنے لگا۔

"دیکھئے مجھے دیر ہو رہی ہے۔ مسٹر ظفر!"

"آپ .... آپ ...."

"آپ رشّو کے متعلق پوچھنا چاہتے ہیں ناں؟"

"جی۔"

"وہ اب مجھے... اب وہ ہمارے ہاں نہیں رہتیں۔ انہوں نے کوٹھی لے لی ہے گلبرگ میں۔"

"آپ مجھے ان کا ایڈریس دے سکتی ہیں..."

ڈمپل یکدم گھبرا گئی۔ ملک صاحب نے تاکید کی تھی کہ کسی کو بھی ان کے گھر کا پتہ نہ دیا جائے۔

"دیکھئے... میں ان کا پتہ آپ کو نہیں دے سکتی مسٹر ظفر... وری سوری ٹرسٹ۔"

"کراچی سے آگئی ہیں رشّو؟"

"جی؟... جی ہاں۔ کبھی کی۔"

"تو... تو ایکبار آپ مجھے ان کا پتہ دے دیجئے... میں دوبارہ ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔ مجھے مبارکباد دینی ہے انہیں۔"

چھوٹے چھوٹے موتی ظفر کی آنکھوں میں جمع ہو گئے۔

"اب وہاں جانے کا کیا فائدہ مسٹر... یو نو... اب تو فضول ہے آپ کا جانا..."

"آخری بار... اور پہلی بار..."

اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوتی۔ پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی۔

"کیوں پھر... کیسی گذری رات؟" ڈمپل نے اس کے لئے توس پر مکھن لگاتے ہوئے پوچھا۔

وشو نے نگاہیں اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

"کیسی رات؟"

"یہی پچھلی... شادی کی پہلی رات..."

وہ ڈمپل کو کیا بتاتی کہ اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی...

ذرا سا اثبات میں سر ہلا کر اس نے کہا۔

"بہت اچھی... جیسی پہلی رات ہوا کرتی ہے، ویسی اور کیسی..."

لیکن یہ جملہ بولتے ہی جیسے اس کے نیچے لگا ہوا فوم ربڑ کا گدا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا... اور تکیے کے پروں میں خود بخود پھڑپھڑاہٹ پیدا ہو گئی... قفس میں بند طوطے کی پھڑپھڑاہٹ....

بار بار اسے وہ پہلا دن... کالج کا پہلا دن یاد آنے لگا۔ اور ریکارڈ کے ایک ہی گرد میں پھنسی ہوئی سوئی پکارنے لگی...

"پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی...؟"

عجیب سے اتفاق کی بات ہے کہ گویہ نکاح نہایت رازداری سے پڑھا گیا تھا پھر بھی اس کی اطلاع سب سے پہلے ظفر کو ہوئی...

اسی روز وہ افتخار، غازی اور رشید کے ساتھ این سکیٹر کی فلم "آئی کنفس" دیکھ کر گھر لوٹا تو این سکیٹر اس کے ساتھ ہی چلی آئی۔ کمرے کو اندر سے کنڈی لگا کر اس نے این کو اپنے پلنگ پر بیٹھنے کے لیے کہا... تو این نظریں جھکا کر بولی...

"یہ تمہارا پلنگ ہے، میں اس پر بیٹھ نہیں سکتی...!"

لمبے کانوں والی این کے بازو چھو کر ظفر نے پوچھا...

"وہ کیوں؟..."

"کیونکہ میں شادی شدہ عورت ہوں۔"

فلم کی ہیروئن کے کندھے جھنجھوڑتے ہوئے یکدم ظفر کو محسوس ہوا جیسے "رشو" اور این سکیٹر ایک ہی چیز ہے۔ جیسے وہ ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔ ایک ہی شکل کی دو لڑکیاں ہیں۔ ایک ہی کیفیت کے دو نام ہیں۔ اس کا سانس زور زور سے پسلیوں سے ٹکرانے لگا... تیسری منزل کی عنبری کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس نے پورے تین گھنٹے اپنے اس پاگل پن پر قابو پانا چاہا۔ لیکن اس کمرے کی ہر چیز "رشو" تھی۔ ہر لمحہ این تھا۔ اور وہ لمحہ وہ چیز ہر بار نظر جھکا کر یہی کہتی تھی... کیونکہ میں شادی شدہ عورت ہوں...

دھوویں سے جھگڑتے جب رات کا پچھلا پہر آ گیا تو اسے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز آئی... وہ اپنے آپ سے اس قدر خوفزدہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنی محبت سے اس وقت ایسا پریشان تھا کہ اس نے آنے والے کا دل

ہی دل میں استقبال کیا۔ اور دروازے کا پٹ کھول کر آنے والے کی راہ دیکھنے لگا۔۔۔۔

ملک صاحب ٹارچ کی روشنی ریلنگ پر ڈالتے اوپر آئے۔ ظفر کو یوں کھڑا پاکر ٹھٹکے۔ لمحہ بھر کو ان کا چہرہ سفید ہوا۔ اور پھر انہوں نے بڑی شفقت سے کہا:

"ابھی تک پڑھ رہے ہو۔۔۔"

"نہیں ابا جی! ویسے ہی جاگ رہا تھا۔"

"اچھا؟۔۔۔۔ اب سو جاؤ۔۔۔"

"اچھا جی۔۔۔"

ملک صاحب ٹارچ کا سپنو لیا چھوڑتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ظفر کو باپ کی شکل دیکھ کر جیسے قرار سا آگیا۔ سفید بال اور لمبا دراز قد۔۔۔۔ لوہے کی لاٹھ خلوص کا پتلا!۔۔ واپس کمرے میں پہنچ کر اس نے جرابیں اتاریں اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔

اس وقت اسے اپنا باپ لائٹ ہاؤس کی مانند نظر آرہا تھا۔ وہ اس باپ کی زندگی کے متعلق رقت کے ساتھ سوچنے لگا۔۔۔ بے چارہ آدمی۔۔۔۔۔ بے چارہ تنہا آدمی! ہماری ماں تو ایک میلے میں رہتی ہے۔ یہ لائٹ ہاؤس وسیع و عریض ساحل کے کنارے گھنگھریالی چٹانوں پر روشنی کا ستون بنے وقت گذارتا ہے۔۔۔۔

میرا باپ کتنا تنہا ہے! کتنا اداس ہے!

"میرا باپ !

میرا باپ !

میرا باپ !

اپنے باپ کی عزت کر !

اپنے باپ کے لرزتے قدم دیکھ !

دیکھ کہ یہ سایہ سورج غروب کے خوف سے لرز رہا ہے۔

دیکھ یہ سایہ شام کی ظلمت سے جھگڑ رہا ہے۔

دیکھ اور سوچ !

یہ سایہ کہیں تیرا اپنا تو نہیں ؟

جب وہ بہت چھوٹا تھا تو اسی طرح اسے ملک صاحب کے متعلق محبت اور خوف میں لپٹے ہوئے کئی چھوٹے چھوٹے سے فکر رہا کرتے تھے۔ اتنے شفیق باپ سے بھلا وہ اپنی مشکلات کا ذکر کیوں نہیں کر سکتا ؟ ... وہ آپا جی سے جا کر کیوں نہیں کہہ سکتا کہ اب وہ ایک لمحہ اور اپنے اوپر ضبط کی طنابیں کھینچ کر نہیں رکھ سکتا... ایسے شفیق باپ کے پاس پہنچ کر تو خود بخود راہیں کھل جائیں گی۔ مسئلے حل ہو جائیں گے ....

نائٹ سوٹ پہن کر جب وہ ملک صاحب کے کمرے کے پاس پہنچا تو کمرہ اندر سے مقفل تھا... اس نے آہستہ سے دستک دی۔ کمرے میں فقط بیڈ لمپ

روشن تھا۔۔ اور ملک صاحب لمبے گرم پاجامے اور اونی واسکٹ میں سونے کی تیاری کر رہے تھے۔۔۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں ابا جی، ظفر۔۔"

گرم فلالین کے بیڈ روم جوتے، وائیلا کا گرم پاجامہ، اور اونی واسکٹ میں ملبوس ملک صاحب نے دروازہ کھولا۔۔۔ ان کے سامنے ظفر کھڑا تھا۔۔۔ اس کے تن پر لکیروں والا نائٹ سوٹ تھا۔ اور پیر ننگے تھے۔ اس کے باوجود اس کے چہرے پر پسینے کے آثار تھے۔۔

"کیوں کیا بات ہے؟" ملک صاحب نے پوچھا۔

"میں آپ کے پاس سو جاؤں ابو جی۔۔"

"ہاں ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ آؤ۔۔۔ آؤ۔"

باپ بیٹا اتنے برسوں کے بعد جب ایک ہی پلنگ میں لیٹے تو دونوں کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی اجنبی کے ساتھ ایک ہی پلنگ میں جا لیٹے ہیں۔ بیڈ لیمپ میز پر روشن تھا۔ اور اس کی روشنی بار بار اس پلاٹینم سیٹ پر پڑتی تھی جو میز پر کھلا پڑا تھا۔ بڑی دیر وہ دونوں خاموش رہے پھر ظفر نے کہنی کے بل ہو کر کہا۔

"ابا جی۔"

"کیا ہے ظفر؟"

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"رات بہت گذر چکی ہے۔ میں تھک چکا ہوں۔ صبح سہی۔"

"ابھی اسی لمحے، اباجی میں پریشان ہوں۔"

کسی انجانے خطرے کو سامنے پا کر ملک صاحب نے تپائی سے عینک اٹھائی اور چہرے پر لگالی۔

"میں اپنے وعدے کی پابندی نہیں کر سکتا اباجی۔"

"کیا مطلب؟"

"میں رشتوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ نہیں رہ سکتا اباجی ... میں ... میں ... آپ سمجھتے کیوں نہیں ... وہ ..."

"میں کیا نہیں سمجھتا؟"

"میں کیا کوئی مرد ... بھی لاتعلق نہیں رہ سکتا اباجی ... وہ بدل رہی ہے۔ تیزی سے بدل رہی ہے۔ مجھے اسے روکنا ہے ... وہ ... وہ اگر اسی طرح بدلتی چلی گئی تو ہمارے درمیان اتنے فاصلے اتنے بُعد پیدا ہو جائیں گے کہ ... کہ میں ... ان فاصلوں کو طے نہیں کر سکوں گا۔"

حجابے کی دبیز خاموشی دونوں پر مسلط ہو گئی ..

"اگر آپ مجھے اس وعدہ سے رہا کر دیں تو ... تو ... میں کم از کم ایک بار۔"

ملک صاحب نے منہ میں سگریٹ لیا اور اسے جلانا بھول گئے ...

"میں اس سے ایکبار شادی کی درخواست کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔۔ ایک بار۔۔۔ میں ۔۔۔ میں اس تذبذب میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں پڑھ نہیں سکتا اباجی ۔۔ میں"

پھر حجاب نے اس کی زبان پکڑی۔

"آپ ۔۔۔ آپ کو میں بتانے آیا تھا اباجی ۔۔۔ کہ میں اپنا وعدہ نہیں رکھ سکتا ۔۔۔ کوئی طاقت ہر لمحہ ہر وقت مجھے یہ وعدہ توڑنے پر اکساتی رہتی ہے ۔۔۔ میں اس طاقت کے خلاف زیادہ دیر تک اپنی کمزور ڈھال کا سہارا نہیں لے سکتا۔"

ملک صاحب خاموش تھے۔

"آپ ۔۔۔ آپ بتایئے ناں ۔۔۔ جواب دیجئے ۔۔۔۔ مجھے رہا کیجئے"

بڑی دیر کے بعد ۔۔۔ ایک صدی کے بعد ملک صاحب بولے ۔۔۔

"اگر میں تمہیں اس وعدہ سے آزاد بھی کر دوں تو بھی تمہیں کچھ فائدہ نہ ہو گا، ظفر ۔۔۔"

"میں اپنے فائدے، اپنے نقصان کی پروا نہیں کرتا۔ میں ۔۔۔ میں صرف ایک بار جاننا چاہتا ہوں اباجی کہ ۔۔۔ کہ ۔۔۔ کہ وہ میرے متعلق کیا سوچتی ہے"

دوسری طرف سے مکمل خاموشی پھر عود کر آئی ۔۔۔

"وہ تمہارے متعلق کچھ نہیں سوچتی ۔۔۔ نہ مثبت نہ منفی ۔۔"

ایک ہی تکیئے پر دونوں کی کہنیاں ٹکی تھیں۔ ان کی سانسوں کی اس وقت

ایک خوشبو تھی۔ اس قرب کے باوجود دونوں اس وقت قطبِ شمالی اور قطب جنوبی کی طرح ایک دوسرے سے دور تھے۔

"وہ... وہ مجھ سے اس قدر لاتعلق نہیں ہو سکتی۔ وہ مجھ سے نفرت کر سکتی ہے لیکن وہ مجھ سے لاتعلق نہیں ہو سکتی... ابا جی..."

ملک صاحب ظفر کو اپنی شادی کی اطلاع نہ دینا چاہتے تھے۔ جس رازداری سے انہوں نے نکاح کیا تھا۔ وہ اس رازداری کو تاحیات قائم رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن نہ جانے ظفر کا چہرہ دیکھ کر انہوں نے فوراً اپنا ارادہ بدل دیا۔

ظفر پانچویں میں پڑھتا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ اور وہ دفتر سے لوٹے تھے۔ ان کے ساتھ وہ سوڈا واٹر کی بوتلیں تھیں جو کسی زمانے میں ربڑ اور کپڑے سے بند ہوا کرتی تھیں۔ ظفر، اظہر، مظہر دوڑ کر ان سے لپٹ گئے۔ اور پھوس کی وہ ٹوکری ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ ایک بوتل گرتے ہی کچھ اس طرح ٹوٹی کہ شیشے کی ایک کرچی ابھر کر ظفر کے گال میں اتر گئی۔

ملک صاحب کے دماغ میں اس روز ظفر کا روتا چہرہ کچھ اس طرح مرتسم ہو چکا تھا کہ اس وقت جب ان کی نظر اس پرانے زخم کے نشان پر پڑی تو وہ اپنے ہاتھ کے تمام پتے میز پر رکھنے کو تیار ہو گئے۔

"اب تمہیں رشو کا خیال چھوڑ دینا چاہیے ظفر!"

"کیوں؟... کیوں ابا جی؟"

"کیونکہ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے۔"

"رشو شادی شدہ عورت ہے! کس کی بیوی ہے وہ؟۔ کس کی بیوی ہے وہ ابا جی؟"

ملک صاحب نے ساری سسکیوں کو سینہ کے اندر تھپک کر کہا۔

"میری!"

"آپ کی بیوی؟.... رشو؟.... آپ کی بیوی؟"

وہ باپ کے پلنگ میں سے اس طرح نکلا جیسے آگ اور دھوئیں سے بھرے ہوئے مکان سے آتش زیر پا مکین نکلتے ہیں۔ زمین پر نظریں گاڑے۔ ٹھنڈے فرش سے پیر چھاتے ظفر تھر تھر کانپ رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ جب راجہ سالواہن کے ہاں پورن پیدا ہو گیا۔ اس وقت

پرندے باغوں کی طرف واپس آ رہے تھے۔

نوبتیں بجنے لگیں۔ سارے دربار نے خوشی منائی۔

سب لوگوں نے راجہ سالواہن کو مبارکباد پیش کی۔

لوناں پانی لینے کے لئے نکلی اور کنوئیں پر آئی۔

راجہ پانچوں کپڑے پہنے اور پانچوں ہتھیار سجائے۔

قلعے سے باہر نکلا اور شکار کے لئے روانہ ہوا۔

اسے کنوئیں کے اندر آہستہ سے رسی ڈالنے والی! تیرے بھائی جیتے رہیں۔

ہم پانی کے پیاسے ہیں۔ ہمیں کٹورہ بھر پانی پلا۔

میں چماروں کی بیٹی ہوں۔ ہم پنچ ذات لوگ ہیں۔

اے لونا! کیا تو ڈھول کی ماردن ہے؟ یا وہ سیتا ہے جسے رام نے گم کر دیا تھا؟

بول! کیا تو جنک کی بیٹی ہے؟

راجہ اسے بیاہ کر اپنے شہر کی طرف چلدیا۔

لونا باندی سے کہنے لگی .... تو جلدی سے شہر میں جا۔

کوئی ایسا آدمی ڈھونڈ کے لا جو مجھ جیسا ہو۔

راجہ سالواہن بوڑھا ہے یہ میرے کام کا نہیں۔

ہیرا باندی وہاں سے چلی اور شہر میں پہنچ گئی۔

اس نے پورن کا چہرہ دیکھا تو غش کھا کر گر پڑی۔

پھر جلدی سے اٹھ کر لونا کے پاس آئی۔

پورن تجھ سے بھی حسین ہے' وہ تیرے لئے موزوں ہے۔

وہ تیری سوت کا بیٹا ہے مگر ہے بہت حسین۔

پورن لونا کے محل میں آیا۔ رام رام کہا اور ماں کے سامنے سیس نوا دیئے۔

مجھے ماتا کہہ۔ میں تیری ہم عمر ہوں۔

کمان زوروں پہ ہے اسے کھینچ کر لطف اٹھا۔

جیسے توڑے سے شعلہ اٹھتا ہے اور بجھائے نہیں بجھتا۔ یہی میری حالت ہے۔

اسے ماتا کیوں دھرم کی جڑ کاٹتی ہو؟

اگر ماں بیٹے میں ایسے تعلقات ہو جائیں تو دنیا تباہ ہو جائے۔

گناہ کا برتن پھینک دو۔ دھرم کے برتن سے غسل کرو۔

تالابوں کے پاس چوہڑ ہیں۔ قصبوں کے پاس گاؤں۔

بادشاہ کے بغیر عزت نہیں۔ گورو کے بغیر نجات نہیں۔ بیٹوں کے بغیر نام باقی نہیں رہتا۔

پورن بھگوان کو یاد کر کے سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

پورن نے چھلانگ لگائی تو اس کا جوتا وہیں رہ گیا۔

سالواہن نے لوناں سے کہا۔۔۔ میری بات سن۔

میں نے راستے میں بہت بدشگون دیکھے ہیں۔ سخت تیز ہوا چل رہی تھی۔

جھٹپٹے کا وقت تھا جب پورن میرے محل میں داخل ہو گیا۔

میں نے سمجھا آپ ہیں۔ اس لئے سیج بچھا دی۔

شیر کے سامنے بکری تھی۔ جیسے اس کا جی چاہا اس نے کھائی۔

میں گائے کے مکھن پر پلی عورت ہوں۔ میں نے اپنا بدن سنبھال کر رکھا تھا۔

اس نے آپ کے سونے کا ڈھیر لوٹ لیا ہے۔۔۔ اسے قتل کر دیجئے۔

بیٹا! کل تم نے لوناں کے محل میں جا کر کمائی کی۔

پتا جی! نہ میں نے آک کی لکڑی کھائی ہے۔ نہ سانپ کا گوشت کھایا ہے۔

چوہڑوں نے نشتروں سے گہرے زخم لگا کر اس کی آنکھیں نکال لیں۔